Islamic Perspective on Economic Thought in the Poetry of Mian Muhammad Bakhsh: A Critical Study of Wealth, Poverty, Distribution of Resources, and Ethical Economics

Dr. Dilshad Rasool
Lecturer, Department of Punjabi, Govt. Graduate College Shahkot, Nankana Sahib.
kissana01@gmail.com
Mamoona Naeem (M.Phil Urdu)
mamoona31868806@gmail.com

Abstract:

This study examines the Islamic Perspective on economic thought embedded in the poetry of *Mian Muhammad Bakhsh*, with particular attention to wealth, poverty, distribution of resources, charity, governance and social responsibility. Focusing mainly on Saif ul Malook, the article argues that *Bakhsh* does not present a formal theory of economics. Instead, his poetry develops a moral and Sufi understanding of economic life. Wealth is treated as temporary and ethically meaningful only when it serves human welfare. The study highlights his concern for the poor, hungry, orphans, travelers and other vulnerable groups. It also shows how generosity, food provision, remission of financial burdens, support for trade and just rule form part of his wider moral vision. A comparative reading with Baba Farid, Sultan Bahu, and Bulleh Shah reveals shared concerns with poverty, detachment, equality and the limits of material status. However, *Bakhsh* gives greater narrative attention to distribution and public welfare. The article concludes that his poetry offers a distinctive model of Sufi moral economy rooted in justice, compassion, responsibility, and collective well being. This perspective also gives his work continuing contemporary social relevance.

Keywords : *Mian Muhammad Bakhsh*, Saif ul Malook, Moral Economy, Wealth, Poverty, Sufi Poetry, Social Welfare

پنجابی صوفی شاعری برصغیر کی فکری تاریخ میں صرف باطنی تجربے، عشق اور معرفت کی زبان نہیں بلکہ روزمرہ معاشرت، انسانی دُکھ، طاقت، محرومی، روٹی اور سماجی تعلقات کی بھی ایک اہم دستاویز ہے۔ اسی روایت میں میاں محمد بخشؒ کا مقام نمایاں ہے۔ ان کی مثنوی "سیف الملوک" بنیادی طور پر عشق، سفر، آزمائش، صبر اور روحانی تکمیل کی داستان ہے۔ لیکن داستانی وسعت کے اندر ایسے متعدد مقامات موجود ہیں جہاں دولت کے حصول، اس کے استعمال، غربت، رعیت کی حالت، سخاوت، مالی بوجھ، تجارت اور حکمران کی ذمہ داری جیسے سوالات سامنے آتے ہیں۔ یہی مقامات

اس امکان کو پیدا کرتے ہیں کہ متن کو صرف صوفیانہ یا عشقیہ مثنوی کے طور پر نہیں بلکہ معاشی اخلاقیات کے ایک ادبی ماخذ کے طور پر بھی پڑھا جائے۔

موجودہ تحقیق میں پہلے سے موجود غربت، دولت، رزق، خیرات اور طبقاتی فرق کے مباحث کو اسی مرکزی نکتے کے گرد از سرِ نو منظم کیا گیا ہے۔ تاہم تحقیق کے معیار کو برقرار رکھنے کے لیے صرف ان اشعار کو بنیادی شہادت بنایا گیا ہے جن کا متن یا شعری شمار قابلِ تصدیق ہے۔ اس تحقیق کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ کیا میاں محمد بخش کی شاعری میں پائے جانے والے دولت، فقر، بھوک، خیرات، عدل اور رعیت سے متعلق بیانات کو ایک مربوط معاشی فکر کے طور پر پڑھا جا سکتا ہے، اور اگر ہاں تو اس فکر کی نوعیت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ضروری ہے کہ جدید علمِ معاشیات کی اصطلاحات کو ماضی کے متن پر غیر محتاط طور پر مسلط نہ کیا جائے۔ میاں محمد بخش نہ قیمتوں کا نظریہ پیش کرتے ہیں، نہ پیداوار و اجرت کا نظام، نہ مالیات یا منڈی کی باقاعدہ تشریح۔ اس لیے انہیں جدید معنوں میں "ماہرِ معاشیات" کہنا تاریخی اور علمی طور پر درست نہیں ہوگا۔ ان کی اہمیت اس امر میں ہے کہ وہ معاشی وسائل اور انسانی ذمہ داری کے تعلق کو اخلاقی اور صوفیانہ سطح پر مسلسل موضوع بناتے ہیں۔

تقابلی حصے میں بابا فریدؒ، سلطان باہوؒ اور بلھے شاہؒ کو اس لیے منتخب کیا گیا ہے کہ یہ تینوں پنجابی صوفی روایت میں دنیا، فقر، خواہش، سماجی مرتبے اور انسانی مساوات کے مختلف رخ نمایاں کرتے ہیں۔ اس تحقیق میں 'اخلاقی معیشت' کی ترکیب اس مفہوم میں استعمال کی گئی ہے کہ معاشی وسائل، لین دین اور اختیار کو صرف مادی فائدے کے بجائے اخلاقی ذمہ داری، انصاف، ضرورت اور اجتماعی خیر کے پیمانے سے پرکھا جائے۔ جدید سماجی تاریخ میں ای۔ پی۔ تھامسن نے "moral economy" کی اصطلاح اٹھارہویں صدی کے انگریز عوام کے ان تصورات کے لیے استعمال کی تھی جن میں خوراک، قیمت، بازار اور باہمی ذمہ داری سے متعلق مقبول اخلاقی توقعات شامل تھیں۔[1] میاں محمد بخش کے متن پر اس تصور کا اطلاق عین تاریخی مماثلت کے طور پر نہیں کیا جا سکتا کیونکہ زمانہ، معاشرتی ساخت، سیاسی ادارے اور ادبی نوعیت سب مختلف ہیں۔ یہاں 'اخلاقی معیشت' ایک محدود تحلیلی اصطلاح ہے، نہ کہ تھامسن کے ماڈل کی براہِ راست نقل۔ میاں محمد بخش کے ہاں اس اخلاقی معیشت کے کم از کم چار اصول سامنے آتے ہیں۔

اول: دولت ناپائیدار ہے، اس لیے اسے حتمی انسانی قدر نہیں بنایا جا سکتا۔

دوم: بنیادی ضروریات سے محرومی ایک حقیقی انسانی مسئلہ ہے اور صاحبِ اختیار شخص پر اس کا اخلاقی بوجھ عائد ہوتا ہے۔

سوم: دولت کا بہتر مصرف گردش، بخشش، خوراک، کفالت اور سماجی آسودگی ہے، محض ذخیرہ اور تفاخر نہیں۔

چہارم: حکمرانی صرف اقتدار کا نام نہیں بلکہ رعیت، مظلوم اور کمزور کے بارے میں جواب دہی کا نام ہے۔

یہ چار اصول ایک ساتھ مل کر متن میں دولت اور انسان کے تعلق کا ایسا تصور بناتے ہیں جسے **'صوفیانہ اخلاقی معیشت'** کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ میاں محمد بخش کی معاشی فکر سمجھنے کے لیے ان کا تصورِ دنیا بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ صوفیانہ روایت میں دنیا، مال اور اقتدار کو مستقل حقیقت کے بجائے عارضی امانت سمجھا جاتا ہے۔ سیف الملوک میں شاعر ایک مقام پر فرماتے ہیں:

چار دہاڑے عمر جوانی، کر لے عیشاں موجاں
سدا نہیں ایہہ دولت دنیا، سدا نہ لشکر فوجاں(2)

یہ شعر بظاہر دنیا کی بے ثباتی کا عمومی صوفیانہ بیان ہے۔ لیکن معاشی نقطۂ نظر سے اس میں ایک اہم تحدید موجود ہے: دولت اور طاقت مستقل نہیں، اس لیے ان کی بنیاد پر انسانی قدر اور دائمی برتری کا دعویٰ قائم نہیں ہو سکتا۔ 'دولت' کے ساتھ 'لشکر فوجاں' کا ذکر خاص طور پر معنی خیز ہے کیونکہ شاعر مادی ملکیت اور سیاسی عسکری طاقت کو ایک ہی فانی دائرے میں رکھ دیتا ہے۔ یوں دولت صرف انفرادی آسائش نہیں رہتی بلکہ اقتدار کے ڈھانچے سے بھی جڑ جاتی ہے۔

اس مقام کو دولت کی مطلق مذمت سمجھنا درست نہیں۔ خود "سیف الملوک" کے دوسرے حصوں میں مال، جائیداد، خلعت، خوراک اور انعام مثبت نتائج پیدا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ فرق دولت کی موجودگی اور دولت پرستی کے درمیان ہے۔ شاعر اس مال کو رد نہیں کرتا جو انسان کے کام آئے، وہ اس تصور کو رد کرتا ہے جس میں مال انسان کی خود قدر، اخلاقی برتری اور دائمی تحفظ کی ضمانت بن جائے۔ اس لیے میاں محمد بخش کا موقف دولت کی مطلق مخالفت نہیں بلکہ دولت کے غرور اور اسے حتمی انسانی قدر بنا دینے کی مخالفت ہے۔ "سیف الملوک" میں معاشی محرومی کا سب سے مضبوط بیان وہ مقام ہے جہاں شاہی خوشی اور فراوانی کو صرف درباری جشن تک محدود نہیں رکھا جاتا بلکہ بھوکے اور ننگے افراد تک پہنچایا جاتا ہے۔

میاں صاحب فرماتے ہیں:

سبھ ملکاں وچ پھرے ڈھنڈورے، جو جو بُھکھے ننگے
شاہاں دے در حاضر ہوئے، دولت دے دے رنگے(3)

اس شعر میں دو سطحیں قابلِ توجہ ہیں۔ پہلی سطح 'بھکھے ننگے' کی صاف شناخت ہے۔ شاعر محرومی کو مجرد روحانی استعارے میں تحلیل نہیں کرتا بلکہ خوراک اور لباس جیسی بنیادی ضروریات کے ذریعے نام دیتا ہے۔ دوسری سطح ریاستی یا شاہی در تک ان افراد کی رسائی اور ان کے لیے وسائل کی فراہمی ہے۔ یہ منظر جدید حقِ معاش یا باقاعدہ قانونی حق نہیں لیکن کم از کم یہ اخلاقی اصول ضرور قائم کرتا ہے کہ اقتدار اور فراوانی کے مرکز پر محروم انسان کا دعویٰ موجود ہے۔

درساں اندر خرچ پوائے، نالے وچ سرائیں
بہت طعام پکا کھلائے، عاماں خاصاں تائیں(4)

یہاں 'عاماں خاصاں' کی ترکیب طبقاتی حد کو نرم کرتی ہے۔ خوراک صرف خواص، امرا یا درباریوں کے لیے نہیں بلکہ عمومی دسترس میں آتی ہے۔ اس کے بعد "نویں سروں کئی لنگر لائے، مِٹھیاں کئی سبیلاں" [5] میں کھانے اور پانی کی فراہمی اجتماعی خیر کی ایک نسبتاً منظم صورت اختیار کرتی ہے۔ لنگر اور سبیل اسلامی و صوفیانہ معاشرت میں خیرات کے ساتھ ساتھ سماجی شمولیت، مہمان نوازی اور بنیادی ضرورت پوری کرنے کے ادارہ جاتی طریقے بھی رہے ہیں۔ اشعار 777 تا 793 سیف الملوک میں ایک ایسا مسلسل بیانیہ تشکیل دیتے ہیں جس میں بخشش، جائیداد، کفالت، مالی رعایت، امن اور تجارت کے عناصر یکجا ہو جاتے ہیں۔ شاعر پہلے سخاوت کی وسعت بیان کرتے ہیں، پھر مال اور جائیداد کی تقسیم کا ذکر آتا ہے۔ یہاں سخاوت کی اخلاقی قدر اس کے نتیجے، یعنی لوگوں کی آسودگی اور رزق کے انتظام سے وابستہ ہے۔

اس سلسلے کا دائرہ مزید وسیع ہوتا ہے۔ نابینا، جسمانی طور پر کمزور اور دوسرے محتاج افراد کے لیے مستقل سہولتوں کا ذکر شعر 783 میں ملتا ہے۔ علماء، فقراء اور گوشہ نشینوں کے لیے مال، پوشاک اور جائیداد شعر 784، اور غیر مسلم مذہبی و روایتی پیشہ ور گروہوں کے لیے بھی عطیات شعر 785 ایک قابلِ غور سماجی وسعت دکھاتے ہیں۔ مزید برآں، جس گھر میں غیر شادی شدہ بیٹی ہو اس کے نکاح، زیور اور لباس کے خرچ کی ادائیگی کا

ذکر شعر 786 میں ہے۔ یہ سب اقدامات جدید فلاحی درجہ بندیاں نہیں لیکن ان میں معاشرتی ذمہ داری کی مختلف صورتیں نمایاں ہیں۔ خصوصاً شعر 787 میں شاعر لکھتے ہیں:

جو مسکین یتیم مسافر، خستہ حال شکستے

سوکھے تے اسودے کیتے، کر عمدے بند بستے(6)

یہاں 'بند بستے' کی ترکیب محض ایک وقتی عطیے سے نسبتاً زیادہ منظم انتظام کا تاثر دیتی ہے۔ مسکین، یتیم اور مسافر تین ایسے گروہ ہیں جن کی معاشی کمزوری اسلامی خیراتی روایت میں بھی نمایاں رہی ہے۔ میاں محمد بخش انہیں داستانی خوشی کے حاشیے پر نہیں رکھتے بلکہ اجتماعی آسودگی کے معیار میں شامل کرتے ہیں۔ اس کے بعد 'اتنی خیر خیرایت کیتی، مایا ونڈ اُڈائی / سبھ کنگال تونگر ہوئے، چھُٹی ٹُکر گدائی' [7] میں دولت کے جمع ہونے کے بجائے پھیلنے اور محرومی گھٹنے کو کامیابی بتایا گیا ہے۔ میاں محمد بخش کے معاشی تصور کا سب سے قابلِ توجہ پہلو یہ ہے کہ فلاح کا بیانیہ خیرات تک محدود نہیں رہتا بلکہ رعیت کے مالی بوجھ اور عدلِ حکمرانی تک پہنچتا ہے۔ بقول شاعر:

ہویا معاف رعیت اُتوں، تین برس دا ہالہ

خوش کیتا مظلوماں تائیں، کر کے عدل سنبھالا(8)

'ہالہ' کی لغوی و تاریخی تعین مختلف مقامی سیاقوں میں مزید تحقیق چاہتی ہے، اس لیے اسے کسی مخصوص جدید ٹیکس کی اصطلاح سے مساوی قرار دینا احتیاط کے خلاف ہوگا۔ تاہم شعر کا مفہوم واضح طور پر رعیت پر موجود مالی واجب الادا بوجھ کی معافی اور اس اقدام کو عدل اور مظلوم کی خوش حالی سے جوڑتا ہے۔ یوں شاعر کے مثالی نظمِ حکومت میں سخاوت صرف ذاتی خیرات نہیں بلکہ اقتدار کے مالی مطالبات میں نرمی بھی ہے۔ اسی تسلسل میں درج ذیل شعر نہایت اہم ہے:

ننگا بھُکھا کوئی نہ رہیا، وچ ولایت ساری
گھاٹ معاف زکاتاں ہویاں، کرن بپار بپاری(9)

یہاں پہلے مصرعے میں فلاح کا معیار بنیادی محرومی کے خاتمے سے وابستہ کیا گیا ہے۔ جبکہ دوسرے میں گھاٹ اور مالی وصولیوں کی معافی کو تاجروں کے کاروبار سے جوڑا گیا ہے۔ اسے جدید آزاد تجارت کی جدید پالیسی کہنا درست نہیں لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ شاعر مالی بوجھ میں کمی اور تجارتی سرگرمی کے درمیان ایک مثبت تعلق تصور کرتا ہے۔ اسی طرح شعر نمبر 792 میں مذہبی و علمی اداروں کے خرچ اور قیدیوں کی رہائی جبکہ شعر نمبر 793 میں سپاہیوں کے انعام اور 'ظالم رہزن' کے خاتمے کا ذکر ہے۔ معاشی آسودگی یہاں امن و قانون سے الگ نہیں۔

میاں محمد بخش کی معاشی اخلاقیات کو پنجابی صوفی روایت کے دوسرے بڑے ناموں کے ساتھ رکھ کر دیکھا جائے تو مماثلت کے ساتھ اہم فرق بھی سامنے آتے ہیں۔ بابا فریدؒ کے معروف شلوک میں بھوک اور سادہ خوراک ایک گہری روحانی علامت بن جاتی ہے:

فریدا روٹی میری کاٹھ دی، لاون میری بھکھ
جنہاں کھادی چوپڑی، گھنے سہن گے دکھ(10)

اس شلوک کو بابا فرید کی ریاضت اور سادہ خوراک کے تاریخی و روحانی سیاق میں نقل کیا ہے۔ بابا فرید کے یہاں 'کاٹھ دی روٹی' اور 'چوپڑی' کے درمیان فرق آسائش اور قناعت کے اخلاقی تقابل کو سامنے لاتا ہے۔ میاں محمد بخش کے ہاں بھی بھوک اخلاقی سوال ہے مگر ان کی داستانی دنیا اس سوال کو صاحبِ اختیار کی طرف منتقل کر دیتی ہے۔ بھوکے کو صرف صبر نہیں، خوراک بھی ملنی چاہیے۔

سلطان باہوؒ کے کلام میں فقر، ترکِ حرص اور معرفت کی دولت بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ سلطان باہو کی روایت میں حقیقی کامیابی باطنی فقر سے وابستہ ہے، دنیاوی مال اپنی جگہ ثانوی ہے۔

ادھی لعنت دنیا تائیں, ساری دنیا داراں ہُو

جیں راہ صاحب خرچ نہ کیتی لین غضب دیاں ماراں ہُو

پیواں کولوں پُت کوہاوے! بھٹھ دنیا مکاراں ہُو

ترک جنہاں دنیا تھیں کیتی لیسن باغ بہاراں ھُو(11)

میاں محمد بخش بھی مال کو حتمی قدر نہیں مانتے، مگر ان کے ہاں ایک اضافی سماجی جہت نمایاں ہے۔ موجود مال کو ضرورت مندوں، مسافروں، یتیموں اور رعیت کی آسودگی کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔یوں دونوں کے ہاں دولت 'مقصد' نہیں مگر میاں محمد بخش اسے سماجی خیر کا 'وسیلہ' بنانے پر نسبتاً زیادہ داستانی زور دیتے ہیں۔ تقابل سے اس لیے میاں محمد بخش کی خصوصیت زیادہ واضح ہوتی ہے کہ بابا فرید کے ہاں محرومی ریاضت اور قناعت کا استعارہ بنتی ہے۔ سلطان باہو کے ہاں فقر معرفت کی راہ ہے۔ بلھے شاہ کے ہاں تفاخر اور درجہ بندی تنقید کا ہدف بنتی ہے۔ بابا بلھے شاہ کے کلام میں ذات پات اور درجہ بندی کے خلاف سب سے مشہور کلام یہ ہے:

بُلھا کیہ جاناں میں کون

نہ میں مومن وچ مسیتاں

نہ میں وچ کُفر دیاں ریتاں

نہ میں پاکاں وچ پلیتاں

نہ میں مُوسیٰ نہ فرعون(12)

اس کلام میں وہ ہر قسم کی شناخت، مذہب، فرقے اور سماجی درجہ بندی کو رد کرتے ہیں، جس کی خاص طور پر اسلام تناظر میں بھی ممانعت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کہتے ہیں کہ وہ نہ مومن مسجد والا ہے، نہ کافروں والے رسم میں، نہ پاک نہ پلید، نہ موسیٰ نہ فرعون؛ بس ایک روح ہے جو کسی زمرے میں بند نہیں ہو سکتی۔ جبکہ میاں محمد بخش کی مثنوی میں انہی اخلاقی اصولوں کے ساتھ وسائل کی تقسیم اور رعیت کی آسودگی کا ایک نسبتاً مفصل داستانی منظر بھی پیدا ہوتا ہے۔

میاں محمد بخش کی شاعری کو آج کے بڑھتے ہوئے صارفیت پسند ماحول میں پڑھنے سے کئی معنی پیدا ہوتے ہیں۔ جدید معاشرت میں آمدنی، ملکیت، برانڈ، رہائش، گاڑی اور ظاہری مصرف سماجی حیثیت کے اشاروں میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ ایسے ماحول میں 'سدا نہیں ایہہ دولت دنیا' کا پیغام صرف فنا کی یاد دہانی نہیں بلکہ قدر کے پیمانے پر سوال بھی ہے۔ اگر دولت مستقل نہیں اور انسانی برتری کی قطعی بنیاد نہیں، تو پھر اس کا اخلاقی جواز

اس کے استعمال، ذمہ داری اور سماجی اثر سے وابستہ ہونا چاہیے۔ سیف الملوک کے فلاحی اشعار اسی سوال کا مثبت رخ دکھاتے ہیں۔ مال اس وقت معنی خیز ہے جب وہ بنیادی ضرورت، معاشرتی تعلق اور امن میں تبدیل ہو۔

تاہم معاصر معنویت بیان کرتے ہوئے تاریخی حدود قائم رکھنا ضروری ہے۔ "سیف الملوک" نہ غربت کی پیمائش کا طریقہ دیتی ہے، نہ ٹیکس کی موزوں شرحیں، نہ سرکاری بجٹ، نہ سماجی بیمہ، نہ محنت کی منڈی یا پیداواری سرمایہ کاری کی تھیوری۔ اسی طرح شاہی بخشش جدید حقوق پر مبنی فلاحی ریاست کا متبادل نہیں۔ جدید فلاحی ریاست میں شہری حق، ادارہ جاتی احتساب، مستقل مالی نظام اور قانونی مساوات بنیادی عناصر ہیں۔ جبکہ مثنوی کا منظر ایک اخلاقی طور پر مثالی بادشاہ کی فیاضی پر قائم ہے۔ اس فرق کو مٹانا ادبی متن کو اس کے عہد سے باہر لے جانا ہوگا۔ یہیں ادبیات اور معیشت کا مفید مکالمہ پیدا ہوتا ہے۔ معاشیات وسائل کی تخصیص، ترغیبات اور اداروں کو سمجھنے کے اوزار فراہم کرتی ہے جبکہ صوفیانہ ادب یہ سوال اٹھاتا ہے کہ وسائل اور اداروں کا انسانی مقصد کیا ہونا چاہیے۔ میاں محمد بخش کی شاعری کی معاصر قدر اسی اخلاقی سوال میں ہے، نہ کہ اسے جدید معاشی پالیسی کا تیار نسخہ سمجھنے میں۔

اس مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ میاں محمد بخش کی شاعری میں معیشت ایک الگ علمی شعبے یا منظم نظریۂ معاشیات کی صورت میں موجود نہیں بلکہ اخلاق، تصوف، معاشرت اور حکمرانی کے ساتھ مربوط ہے۔ "سیف الملوک" میں دولت کی بے ثباتی، بھوک اور ننگ کی شناخت، خوراک کی عمومی فراہمی سے لے کر لنگر و سبیل، مال و جائیداد کی تقسیم تک کے موضوعات باہم جڑے ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مسکینوں، یتیموں اور مسافروں کی کفالت، رعیت کے مالی بوجھ میں تخفیف، تاجروں کے لیے آسانی، قیدیوں کی رہائی، امنِ عامہ اور حکمران کی جوابدہی بھی اسی فکر کا اہم حصہ ہیں۔ اس لیے ان منتشر اشارات کو جمع کرنے پر دولت کے بارے میں ایک نسبتاً واضح اخلاقی موقف سامنے آتا ہے۔ اس موقف کا بنیادی اصول یہ ہے کہ دولت کی قدر محض ملکیت یا جمع ہونے میں نہیں بلکہ اس کے انسانی مصرف میں ہے۔ مال اگر تفاخر، جبر اور خود غرضی کو بڑھاتا ہے تو صوفیانہ معیار پر محدود اور عارضی ہے۔ اگر وہ بنیادی ضرورت پوری کرتا، کمزور کو سہارا دیتا اور اجتماعی آسودگی میں تبدیل ہوتا ہے، تو مثبت اخلاقی معنی اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح حکمران کی عظمت لشکر، دولت اور جاہ سے نہیں بلکہ رعیت، مظلوم اور امن کے بارے میں اس کے عمل سے پرکھی جاتی ہے۔

لہٰذا ان کی فکر کو 'صوفیانہ اخلاقی معیشت اسلامی تناظر میں ' کہنا مفید ہے۔ بشرطیکہ اس اصطلاح کو جدید فلاحی معاشیات یا تھامسن کے تاریخی اخلاقی معیشت کے تاریخی نمونے کا عین مترادف نہ سمجھا جائے۔ میاں محمد بخش ہمیں کوئی معاشی پالیسی یا فارمولا نہیں دیتے بلکہ آپ ایک اخلاقی

معیار دیتے ہیں جو کہ اسلامی تناظر کے عین مطابق ہے۔ دولت انسان پر حاکم نہ ہو، انسان اسے ذمہ داری سے استعمال کرے، بھوک اور محرومی کو صرف فرد کا مقدر نہ سمجھا جائے اور اختیار اپنی حقیقی قدر عدل، سخاوت اور انسانی بہبود سے حاصل کرے۔ یہی اسلامی زاویہ ان کی شاعری کو موجودہ معاشی ناہمواری، مادہ پرستی اور سماجی بے حسی کے دور میں بھی معنی خیز بناتا ہے۔

حوالہ جات:

1. Thompson, E. P. The Moral Economy of the English Crowd in the Eighteenth Century.(Past & Present, 50(1), 1971)76–136
2. Faqir Muhammad Faqir, Dr. Saif-Ul-Malook:edited (Lahore: Al Faisal Publications,2015) 76
3. Ibid, p:519
4. Ibid, p:519
5. Ibid, p:520
6. Ibid, p:520
7. Ibid, p:520
8. Ibid, p:520
9. Ibid, p:520
10. Khan,M.Asif. Aakhya Baba Farid nay(Lahore:Pakistan Punjabi Adbi Board,1989) 171
11. Ahmad, Dr. Syed Nazir. Kalam-e-Sultan Bahu(edited) (Lahore: Pakages Ltd, 1981) 2
12. Faqir Muhammad Faqir, Dr. Kuliyaat-e- Bulhay Shah: edited (Lahore: Punjabi Adbi Academy,1960) 44